تاریخ ہندستان کی تمہید

مقالہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
(اکتوبر ۱۹۳۷ء)

از

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے۔ (آکسن)

مکتبہ جامعہ

دہلی ۔ لاہور ۔ لکھنؤ

دیباچہ

یہ مقالہ جو پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اردو اکادمی میں پڑھا اصل میں مقدمہ ہے ایک مختصر تاریخ ہند کا جس کے لکھنے کی وہ ایک مدت سے تیاری کر رہے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ انگریزی تعلیم سے ہندستانیوں کو فائدے کے ساتھ نقصان بھی پہنچا اور اس نقصان کی ذمہ داری زیادہ تر تاریخ کی درسی کتابوں پر ہے جو غیر ملکی مصنفین نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہندستانی ذہن کو مسخ کرنے کے لئے لکھیں۔ اب وہ وقت آیا ہے کہ ہندستان کی سچی اور صحیح تاریخ لکھ کر اس نقصان کی تلافی کی جائے۔ اس کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں محمد مجیب صاحب کی کوشش، جہاں تک ان کی اس تمہید سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر دلچسپ ہوگی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہماری تاریخ منتشر اور بے ربط " واقعات کی کھتونی" نہیں بلکہ ایک مسلسل اور مربوط کہانی ہے اس جغرافی، سیاسی اور سیاسی تصور وحدت کے ارتقا کی جو آج

"ہندستان" کا لفظ ہمارے ذہن میں پیدا کرتا ہے اور اس داستان کا "ترستم داستان" ہندستانی مسلمان ہے۔ اگر وہ اس دعوے کا بے لاگ اور بے داغ ثبوت پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے جو کڑی سے کڑی کسوٹی پر پورا اترے تو یہ نہ صرف ایک قابل قدر علمی خدمت ہو گی بلکہ اس کا ہمارے ابنائے وطن کے سیاسی خیالات پر بہت گہرا اثر پڑے گا۔ لیکن سیاست تاریخ سے کتنی ہی متاثر کیوں نہ ہو تاریخ کو وقتی سیاست سے متاثر نہیں ہونا چاہیئے۔ جس راہ پر مورخ چلتا ہے وہ بال سے زیادہ باریک ہے۔ ہر قدم پر یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں وہ سچائی کی لیکھ سے ہٹ کر سیاسی تبلیغ کے بیہڑ میں نہ جا پھنسے۔ امید ہے کہ حق کی محبت مجیب صاحب کو اس راہ میں ثابت قدم رکھے گی۔

سیّد عابد حسین

مارچ سنہ ۳۹ء

تاریخ ہندستان کی تمہید

کوئی اسی نوے برس ہوئے فرانس کے ایک مفکر نے یورپ والوں کو یہ مژدہ سنایا تھا کہ علوم صحیحہ کی تیز اور باطل سوز روشنی انسانی ذہن کو توہمات اور خام خیالی سے پاک کر رہی ہے، اور اب حقیقت اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ افروز ہو گئی ہے۔ اسی مفکر نے تاریخ کو علوم صحیحہ میں شمار ہونے کا شرف بخشا، اور انسانی تاریخ کو تین دوروں میں تقسیم کیا، جن میں سے پہلا دینیات کا دور تھا، دوسرا مافوق الطبیعیات کا، تیسرا، یعنی خود اس مفکر کا زمانہ، علم کا دور تھا۔ اس طرح ترقی کا سلسلہ واضح ہو گیا، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ علم کا آسمان کہاں ہے اور آفتاب کون۔ لیکن علوم صحیحہ کی تلوار بھی دو دھاری

ہے، ہمارے مفکر کی تمام قطعی اور اثباتی حقیقتیں نئی تحقیق کے لئے میدان
صاف کرنے کی خاطر جھاڑ جھنکار کی طرح کاٹ کر برابر کردی گئیں، اور علم کے
آسمان پر ستارے ٹکراتے اور ٹوٹتے رہے۔ مجھے یہاں اور حقیقتوں سے جنھوں نے
دنیا کو روشن کیا بحث نہیں، بس ایک ہے جو برسوں سے دل میں کھٹک
رہی ہے۔ یہ علوم صحیحہ اور علمی فلسفۂ حیات کے ایک انگریز شیدائی سر ہنری
سمر مین (Sir Henry Simmer Maine) کا نظریہ ہے کہ ساری
دنیا دو طرح کی قوموں میں تقسیم کی جاسکتی ہے، ایک تو وہ جن میں ترقی کا مادہ
ہے، اور دوسری وہ جن میں یہ جوہر نہیں ہے۔ ترقی کا مادہ رکھنے والی قومیں
ظاہر ہے وہی ہیں جو یورپ میں آباد ہیں، اور جو اپنی شاخیں ادھر اُدھر
پھیلا چکی ہیں۔ باقی سب، یعنی ہم ایشیا والے خاص طور پر، اور ہمارے آباؤ
اجداد، نوعِ انسانی کی اس بہت بڑی اکثریت میں شمار کئے جاسکتے ہیں
جو ترقی کے مادے سے محروم ہے، جو ایک خاص منزل پر آکر رک گئی ہے
اور اس کے آگے دوسروں کی رہنمائی پر بھی نہیں بڑھ سکتی۔ بڑے فرانسیسی
مفکر کا یہ چھوٹا انگریز بیٹا ہندستان کی سول سروس میں ملازم تھا، وہ پنشن کے
علاوہ کٹر پن اور صاحب بہادر کا دماغ بھی اپنے ساتھ انگلستان واپس
لے گیا۔ یہی ایک بات اس کے نظریے کو تعصب کی ایک شکل ثابت

کرنے کو کافی ہے، لیکن اس کے علاوہ خالص علمی طریقے پر اس کے دعوے رد کیے جا چکے ہیں۔ پھر بھی اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مین (Maine) نے جو بات کہی وہ ہم سب کے دلوں میں گھر کیے ہوئے ہے اور ہم اپنے آپ کو یہ سمجھا نہیں سکتے کہ پچھلے ہزار ڈیڑھ ہزار برس میں ہم نے ترقی کی ہے یا تنزل، اور ترقی کی ہے تو کس طرح۔ ہمارے ہندو بھائی اپنے عروج کا زمانہ صرف قدیم آریہ تہذیب کو مانتے ہیں، اور اس کے اجالے کے بعد انھیں ایک تاریکی نظر آتی ہے جس میں غصے کی آگ کے سوا زندگی اور روشنی کی کوئی علامت نہیں ملتی۔ ہم مسلمان ان سے بھی بڑھ گئے ہیں، ہمیں چند بادشاہوں کے نام یاد ہیں، چند لڑائیوں کا نتیجہ معلوم ہے، اور بس۔ ہمارے پرانے مورخ لڑائیوں اور سازشوں، وقتی کامیابیوں اور ناکامیوں میں الجھے رہے، ہمارے نئے مورخ انھیں کے بیانات کی تحقیق تفتیش میں پڑے رہتے ہیں۔ اپنی تنگ نظری کے باوجود دونوں نے بہت ضروری اور مفید کام کیا ہے۔ پرانے مورخوں کی بدولت مسلمانوں کے ہندستان آنے کے بعد سے ملک کی مسلسل اور خاصی مستند تاریخ تیار ہو گئی، اور جدید تحقیق نے اس زمانے پر روشنی ڈالی ہے جو ہماری نظروں سے چھپ گیا تھا۔ مٹی کے ڈھیر تمدنوں کے آثار ڈھانپے ہوئے تھے، وہ ہٹائے گئے ہیں اور ان آثار کا سہارا لے کر نیا اس نے

ویرانوں میں آبادی کی چہل پہل کردی ہے۔ پرانی کتابیں، جن کا تقدس مورخ کو چھان بین کی اجازت نہیں دیتا تھا، معلومات کا خزانہ بنائی گئی ہیں۔ سکوں اور کتبوں سے تہذیب، مذہب، معاشرت کے بھید اور دلوں کے راز اور حوصلے معلوم کیے گئے ہیں۔ ہم یہ شکایت ہرگز نہیں کر سکتے کہ ہمارا علمی سرمایہ کم ہے، یا اس میں بڑھتی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ شکوہ بالکل بجا ہوگا کہ یہ علم ایک بوجھ ہے جس سے ہم میں بار برداری کی صلاحیت پیدا ہو رہی اور ہمیں چاہیے بصیرت۔

تاریخ کی دینی، اخلاقی اور سیاسی حیثیت اور زمانے کی مصلحتوں کو دیکھتے ہوئے میرے ناچیز خیال میں ہم کو تفصیلی مطالعے سے زیادہ اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ ہماری تاریخ نے کس مجموعی شکل کیا ہے، اور جو کچھ ہمیں معلوم ہو چکا ہے اور تفصیلی مطالعے کی بدولت معلوم ہوتا رہے گا اس سے سب سے پہلے اسی مجموعی ہیئت کو واضح اور روشن کرنے میں مدد لینا چاہیے۔ آج کل اصولی بحث سچے علم کی شان کے خلاف سمجھی جاتی ہے، کیونکہ اس میں قیاس اور قیاس کے ساتھ تعصب بہت زیادہ دخل انداز ہو جاتا ہے، اور عقلی دلائل علم کی ان خصوصیات اور علوم کی اس تفریق کو بگاڑ دیتی ہیں جو صدیوں کی محنت اور محنت کے بعد قائم ہوئی ہے۔

اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اگر تاریخ کی خالص علمی اور اثباتی حیثیت کو نظرانداز کیا گیا تو ہندستان میں مورخ بننے کے لیے تاریخ پڑھنا بھی ضروری نہ رہے گا، اور ہر طرح کی خیال آرائی جس سے افراد اور جماعتوں کی ذاتی اغراض کو تقویت پہنچے گی تاریخ کا بھیس بنا کر دھوکا دینے کو کھڑی ہو جائے گی۔ لیکن سمجھنے والے سمجھتے ہیں کہ قیاس اور تعصب انسان کا پیچھا اس وقت بھی نہیں چھوڑتے جب اس کا مقصد خالص علمی ہو اور اس نے ارادہ کر لیا ہو کہ عقلی دلائل سے پرہیز کر کے حقیقت اسی کو مانے گا جس کے لیے قطعی ثبوت موجود ہو۔ ہندستان کی آپ کو بہت سی تاریخیں ملیں گی جو خالص علمی تصانیف ہیں مگر نہ ایسے نظریوں سے پاک ہیں جن کی اصلیت محض قیاس ہے نہ ایسے خیالات سے جن پر تعصب کا شبہ ہو سکتا ہے۔ اور دوسری طرف اگر ہم ان ٹکڑوں کو جو علمی تحقیق نے فراہم کئے ہیں جوڑ کر ایک پوری چیز بنانا چاہیں تو یہ لازمی نہیں ہے کہ قیاس کے سوا جوڑ ٹھیک بٹھانے کے لئے ہمیں اور کوئی ذریعہ نہ ملے، یا اس وقت تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ بھی ہاتھ سے جائیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے دنیا کے صرف اس ذرا سے حصے کو دیکھ سکتے ہیں جس میں ہم موجود ہوتے ہیں، اگر ہم دنیا کا چکر لگائیں تب بھی ہم وہی ذرا ذرا سے حصے

دیکھیں گے جو ہماری نظر میں آسکتے ہیں۔ اسی طرح دیکھ دیکھ کر ہم نے دنیا کو جانا اور پہچانا ہے، مجموعی حیثیت سے دنیا ہمارے لئے ایک قیاس رہتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا کی جو شکل تصور کی گئی ہے وہ غلط ہے۔ علم اور قیاس میں دراصل ہم آہنگی چاہیئے اور دونوں کو اس جذبے سے متاثر ہونا چاہیئے جو انسان کو ازل سے حقیقت اور نور کی طرف کھینچتا رہا ہے۔

تاریخ کا مفہوم بھی ایسا نہیں ہے کہ ہم بالکل تجربے اور ثبوت کے پابند ہو سکیں۔ انسان کے دل کا حال دوسروں پر کبھی پورا پورا ظاہر نہیں ہوتا، پھر وہ علم جس کا تعلق سراسر اغراض، نیت اور حوصلے سے ہے ایک کیمیاوی نسخے کی طرح ہمارے قابو میں کیسے آسکتا ہے۔

مورخ کا بیشک سب سے پہلا اور بڑا فرض یہ ہے کہ صحیح واقعات اور حالات دریافت کرے اور انھیں پر اپنی رائے کو منحصر کرے لیکن مورخ کو سب کچھ معلوم ہو تب بھی اس کی رائے قطعی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اپنی رائے قائم کرنے میں وہ اپنے زمانے کے حالات، تصورات، مخصوص تعصبات اور مذاق سے یقیناً متاثر ہوگا، اور اس کے علاوہ اس کا نقطۂ نظر بھی لازمی طور پر شخصی ہوگا۔ جب ہم یہ بھی فرض نہیں کر سکتے کہ مورخ

کو سب کچھ معلوم ہے تو پھر تاریخ کا علوم صحیحہ کے معیار پر جانچنا اور مورخ سے خالص علمی اور غیر شخصی انداز کا مطالبہ کرنا فضول ہے۔ ہماری تاریخ ہماری موجودہ زندگی میں اسی طرح شامل ہے جیسے کہ ہمارے آباؤ اجداد کا خون ہمارے خون میں۔ مورخ کا کام زمین سے ہڈیاں کھود کر نکالنا اور انھیں جوڑ کر پنجر کی شکل دینا، دوسروں کی کتابیں پڑھ کر ایک نئی کتاب لکھ دینا نہیں ہے۔ اس کا فرض زندگی سے زندگی کا رشتہ جوڑنا، ایک دل کی بات دوسرے تک پہنچانا ہے۔ وہ نہ مبلغ ہو سکتا ہے نہ محتسب، نہ وکیل اور نہ منصف، لیکن اسے حق کا دوست اور باطل کا دشمن، نکتہ بیں اور قدر شناس، غلط اور صحیح، مضر اور مفید میں فرق کرنے کا اہل ضرور ہونا چاہیے۔

ہر مورخ کو اپنے موضوع سے زندہ اور گہرا تعلق ہونا چاہیے اگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہر مورخ کا فرض ہے کہ وہ قومی مورخ ہو، اپنے تخیل کو ذاتی، مقامی یا قومی اغراض میں قید کر دے، اور دنیا کو سمٹا کر اتنی چھوٹی کر لے کہ وہ پوری پوری اس کی نظر میں سما جائے۔ تاریخ کا رشتہ انسانی ہے، جغرافی نہیں ہے، یعنی اگر کوئی ہندستانی عرب کی ایک شخصیت کو ہندستان کی تمام خیالی اور حقیقی شخصیتوں سے برتر اور قریب تر

سمجھے اور زیادہ عزیز رکھے تو اس سے کسی تاریخی معیار کی خلاف ورزی نہیں ہوتی اور سچی قومیت کو صدمہ نہیں پہنچتا۔ اس کے برعکس، یہ حقیقت کہ ہندستان ایک بالکل محدود ملک نہیں ہے، اور بہت سے ہندستانی ایسے ہیں جو اپنی تاریخ اور تہذیب کو جغرافی حدبندیوں سے بالاتر سمجھتے ہیں ہندستان کے مورخ کو دوسرے قومی مورخوں سے زیادہ آزاد کردیتی ہے اور وہ اپنے علم کو تنگ نظری اور تعصب سے پاک کرکے اسے بصیرت اور حوصلہ افزائی کا نہایت ہی مؤثر ذریعہ بنا سکتا ہے۔ یہ دراصل مورخوں کی نااہلیت ہے کہ وہ ہماری زندگی کی وسعت کی قدر نہیں کرتے اور ہماری تاریخ کو ملک، نسل، معاشرت اور مذہب کے احاطے میں بند کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ قومیت کا نیا فلسفہ وسعت کو برداشت نہیں کرسکتا۔

میرے اس ناچیز مقالے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ہندستانی زندگی کی وسعت کے باوجود ہماری تاریخ تسلسل اور یک جہتی، حوصلے اور ترقی کی داستان ہے۔ ہم خود ادھر دھیان نہیں کرتے، ورنہ یہ کہانی تو ایسی ہے کہ نیند کے ماتے بھی جوش اور ولولے سے اچھل پڑیں۔

سب سے پہلے اس ملک کو دیکھئے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ دکن اور جنوبی ہند کے لوگ ہندستان کے مہذب باشندوں میں سب سے پرانے

ہیں اور وہ نہ جانے کب سے آہستہ آہستہ ترقی کر رہے ہیں، شمالی ہندستان میں تہذیب کی صورت سب سے پہلے ہمیں موہنجو داڑو اور ہڑپا کے آثار قدیمہ میں نظر آتی ہے۔ اس تہذیب کا لین دین مغرب کی طرف تو ہم جانتے ہیں کہ کن لوگوں سے تھا، مشرق کی طرف اس کا پھیلاؤ کتنا تھا یہ بتانا ابھی ممکن نہیں۔ جنوبی ہندستان کی قدیم آبادی اور اس تہذیب سے جس نے وہاں پرورش پائی موہنجوداڑو والے آشنا ضرور تھے، لیکن ایسی ہی آشنائی بابل اور مصر والوں سے بھی تھی۔ یعنی ابتدا میں ہندستان کے بعض حصے کسی قدر آباد تھے، لیکن وہ ایک ملک نہیں تھا، کیونکہ یہاں کی آبادی اور تہذیبی مرکزوں میں وہ قرابت نہیں تھی جو ایک ملک کے باشندوں میں ہزار جھگڑوں اور عداوتوں کے باوجود ہوتی ہے۔

اب سے کوئی چار ہزار برس پہلے آریہ ہندستان میں آکر بسنے لگے۔ اس وقت گنگا اور سندھ کی وادیوں میں ایک قدیم نسل کے قبیلے آباد تھے۔ اس نسل کا ابھی تک کوئی نام نہیں رکھا جاسکا ہے، لیکن میرے خیال میں اس کا رشتہ گونڈ، بھیل، سنتال اور اسی قسم کے دوسرے پس ماندہ قبائل سے جوڑنا غلط ہے، کیونکہ یہ نسل تہذیب اور تمدن میں ان قبیلوں سے بہت آگے بڑھی ہوئی تھی۔ بہرحال ہمیں صرف یہاں یہ جتانا ہے کہ آریوں

سے پہلے ہندستان قبیلوں کی زمین اور بستیوں کا مجموعہ تھا اور اس کا کوئی ایک نام نہیں تھا۔ آریہ بھی اسی طرح قبیلوں میں آباد ہوئے، ان کے یہاں ہر علم تھا، تاریخ نویسی کا رواج نہ تھا، ان کی روایتوں نے ایک مجموعی شکل نہیں پائی، ان کے معاشرتی تصورات سے ملک اور ملکی زندگی کی حیثیت نہیں بنی۔ ملک کی شیرازہ بندی کے سلسلے میں جو کچھ ہوا وہ خود بخود ہوا۔ راجہ قبیلے کی زمین کے مالک بن گئے، ایک دوسرے سے لڑنے لگے، کامیابیوں نے حوصلے بڑھائے، اور چوتھی صدی (ق-م) کے آخر میں آکر موریا سامراج قائم ہوا۔ اس سامراج نے حوصلہ مند بادشاہوں کے سامنے ایک نصب العین پیش کیا، لیکن عام تخیل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور ملکی زندگی کا ڈھب نہیں بدلا۔ مقام کی قدر وہی رہی جو پہلے تھی، دیس اور وطن سے مطلب پہلے کی طرح گاؤں یا شہر یا قبیلے کی زمین رہی، رسم الخط اور بولیوں میں پہلے کا سا اختلاف رہا، مذہب اور معاشرت دونوں مقام کے پابند رہے۔ ابھی تک آبادی وادیوں کی گود میں بیٹھی تھی، کبھی چلتی پھرتی تو دو تین بڑی شاہ راہوں کا سہارا لے کر۔ ان شاہ راہوں میں ایک پشاور سے سیالکوٹ اور متھرا سے جمنا کے کنارے کنارے الٰہ آباد تک جاتی تھی، اور وہاں سے گنگا کے ساتھ پاٹلی پوتر، یعنی موجودہ شہر پٹنہ تک۔ دوسری شاہ راہ الٰہ آباد

سے بھیل اور اجین ہوکر بھڑوچ جاتی تھی، تیسری اجین سے متھرا۔ قدیم زمانے میں شمالی ہندستان انھیں تین شاہ راہوں پر مشتمل تھا، جنوبی ہند کی آبادی کے بھی تین چار مرکز تھے، جن کی اپنی زراعت، صنعت اور بیرونی تجارت کے لئے الگ الگ اتنا قدرتی سامان تھا کہ اتحاد کی ضرورت اور خواہش ہی نہ ہوئی۔

موریا سامراج کے دو سو برس بعد شمالی ہند میں کشن سامراج قائم ہوا۔ کشن قبیلے منگول، یعنی ہندستانیوں کے لئے بالکل غیر لوگ تھے، اور ان کا سامراج ایک دیو تھا جس کا ایک قدم سندھ اور گنگا، دوسرا جیہوں اور سیہوں کی وادیوں میں تھا۔ کشن خاندان کے سب سے ممتاز بادشاہ کنشک نے ہندستانی اور وسط ایشیا کی یونانی تہذیبوں کو ملایا، اور مذہب کو اتحاد کا ذریعہ بنایا۔ اسی دور کے بعد ہندستانی علم اور تہذیب کا مشرقی دنیا میں شہرہ ہوا، اور ہندستان کے اندر وہ تہذیبی دولت جو اب تک باہر سے آئی تھی قومی مذاق کے مطابق کام میں لائی گئی۔

موریا سامراج گنگا کی وادی سے شمال کی طرف اور وسط ہند کی شاہ راہ سے مغرب کی طرف پھیلا تھا، اس کا مرکز پاٹلی پوتر تھا کشن سامراج پشاور سے جنوب کی طرف وسط ہند کے پہاڑوں اور جنگلوں تک پہنچا۔

گپت سامراج، جو ان کے بعد چوتھی صدی سنہء میں قائم ہوا گنگا کی وادی اور وسط ہند کی تجارتی شاہ راہ تک محدود رہا۔ پہلے گپت بادشاہ کا دارالسلطنت پاٹلی پوتر، دوسرے کا ایودھیا اور تیسرے کا اجین تھا۔ اس زمانے کی خصوصیت بڑے شہر، ترقی یافتہ صنعت اور بیرونی تجارت کا پھیلاؤ ہے، اور اجین کے دارالسلطنت بننے کے معنی یہ ہیں کہ سوداگری نے حکومت کو اپنا مہمان بنا کر رکھا تھا۔ اس زمانے میں پہلی مرتبہ مال کی بڑے پیمانے پر آمد و رفت شروع ہوئی، اور صنعت اور تجارت دوسرے پیشوں پر غالب آگئیں۔ قوم کا تو اس وقت بھی کوئی تصور نہیں تھا، لیکن کالی داس اور بھرتری ہری کی نظموں میں ہندستان کے مناظر ایسے شوق اور ایسی خوبی کے ساتھ دکھائے گئے ہیں جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ ملک کا تصور قائم ہو رہا تھا۔

پھر بھی ہندستان کو وادیوں اور شاہ راہوں کی قید سے نکالنے کا سہرا اس زمانے کے سر ہے جو راجپوت دور کہلاتا ہے۔ اس وقت گپت عہد کے بڑے شہر ویران ہو چکے تھے، تجارت اپنے حوصلے بھول گئی تھی، صنعت صرف کہیں کہیں اپنا نام باقی رکھ سکی تھی۔ ہندستان کے مغربی حصے میں ایسے قبیلے جو پانچویں اور چھٹی صدی میں ملک کے اندر گھس

آئے تھے، اور مشرقی حصے میں پرانے نیم مہذب قبیلے جو موقع کے انتظار میں بیٹھے تھے سیاسی میدان میں آئے۔ یہ لوگ دیہاتی زندگی کے عادی تھے، انھوں نے شہر آباد نہیں کئے، قلعے بناتے رہے، صنعت اور تجارت کی بھی انھوں نے دست گیری نہیں کی، لیکن جنگل اور آبادی کی جو حدیں قائم ہو گئی تھیں ان کو انھوں نے توڑ دیا، شہر اور دیہات کو ایک دوسرے سے آشنا کر دیا۔ ان کے حوصلے مصلحت کے پابند نہیں تھے، ان کی سلطنتیں اس طرح محفوظ اور محدود نہیں تھیں جیسے کہ اصول اور قاعدے کے مطابق ریاستوں کو ہونا چاہئے اور انھوں نے تقریباً سارے ہندستان کو ایک دیہات، ایک زمینداری کی شکل دے دی۔ راجپوت دور وہ زمانہ بھی ہے جب جنوبی ہندستان اور دکن کے حوصلہ مند بادشاہ شمال پر حملے کرنے لگے، اور شمال اور جنوب کے درمیان بیگانگی کی جو دیوار حائل تھی وہ گرا دی گئی۔ اس طرح گپت سامراج کے تباہ ہونے سے تہذیب اور تمدن کو جو نقصان ہوا تھا وہ ملک کے تصور کو وسعت دے کر پورا کیا گیا۔ نشو و نما کے اس سلسلے کی تکمیل مسلمانوں کے ہاتھوں ہوئی۔ ہندستان کا لفظ وہ اپنے ساتھ لائے اور یہ ہمارے ملک کا پہلا اور سب سے مستند نام ہے۔ شاید اس سبب سے کہ شمالی ہندستان قدرتی ساخت کے لحاظ سے ملک کا ایک

الگ حصہ ٹھہرایا جاسکتا ہے اور سیاسی نقطۂ نظر سے بھی وہ ایک مکمل ریاست ہوسکتا ہے، کیونکہ اس کی ناکہ بندی کی جاسکتی ہے۔ ایک عرصے تک ہندستان شمالی ہند کا اصطلاحی نام رہا اور دکن کا جزیرہ نما ہندستان سے خارج سمجھا گیا۔ لیکن دوسری طرف ہمیں یاد رکھنا چاہیۓ کہ مسلمانوں کے تصورات پر ہندستان کے اندر کی جغرافی حدبندیوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کا حوصلہ تھا کہ کشمیر سے راس کماری اور بلوچستان سے آسام تک ایک خطبہ اور ایک سکہ ہو اور ایک مرکز سے حکومت کی جائے۔ اس حوصلے کو پورا کرنے کی تدبیروں نے ہندستان کا نقشہ بدل دیا۔ ہزاروں جنگل کٹوا کر آبادی اور زراعت کے لئے جگہ نکالی گئی، ریاست کی آمدنی بڑھانے کی فکر میں دور افتادہ گانوؤں اور زمینداریوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی، شہروں سے دیہاتوں تک رستے بنائے گئے اور رعایا کے جان و مال کی طرح ان رستوں کی بھی حفاظت کی گئی۔ اس طرح ہندستان آبادی کے اعتبار سے آہستہ آہستہ اتنا ہی بڑا ہوگیا جتنا کہ قدرت نے اسے بنایا ہے اور اگر مسلمان مقام پرست نہ ہوگئے تو یہ ملک کبھی سمٹ کر یا ٹوٹ کر چھوٹا نہ ہوسکے گا۔

یہ ہے ہندستان کے بڑھ کر اپنی قدرتی وسعت تک پہنچنے کی داستان۔ اب یہ دیکھیے کہ اس ملک کے باشندے ہندستانی کیسے بنے یعنی انھوں نے

وہ غیریت اور عداوت جو شروع میں انسانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے درمیان ہوتی ہے کیسے چھوڑی، اور نسل، معاشرت اور مذہب کا اختلاف ہوتے ہوئے ان میں سیاسی اتحاد اور اشتراک کا حوصلہ کیسے پیدا ہوا۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ بالکل شروع میں انسانی زندگی کا سیال مادہ ان مقامات پر جمع ہوا جہاں قدرت نے اس کے فروغ پانے کے لئے آسانیاں پیدا کی تھیں۔ پہلے ہندستان ان ملکوں میں شمار نہیں ہوتا تھا جنھیں قدرت نے تہذیب کے گہوارے بننے کے لئے موزوں بنایا ہے اور ہماری تاریخ اس زمانے سے شروع کی جاتی تھی جب آریا یہاں آئے اور یہاں کے وحشیوں کو جو کالے اور بدصورت تھے اور جنگلوں میں بندروں کی طرح درختوں پر اچکتے پھرتے تھے مار بھگایا۔ لیکن اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ سندھ کی وادی اور اس سے بھی پہلے جنوبی ہندستان آدمیوں سے آباد ہوا اور حوصلے اور تجربے نے ان آدمیوں کو آہستہ آہستہ انسان بنا دیا۔ جنوبی ہندستان اور دکن کو چین کی طرح یہ شرف بھی حاصل ہے کہ وہاں نشو و نما کا سلسلہ رکا یا ٹوٹا نہیں اور نسلوں اور قوموں کے تصادم کے بغیر ترقی ہوتی رہی۔ آریا جب ہندستان میں آئے تو یہاں کی آبادی انھیں کے برابر اور کہیں کہیں ان سے بہت زیادہ مہذب تھی اور اگر وہ ترقی کا مادہ لے کر آئے تو یہاں

سے بھی انھوں نے وہ سامان حاصل کیا جس کے بغیر تہذیب کی ابتدائی منزلوں سے گذرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

لیکن اور جو کچھ آریا اپنے ساتھ لائے ہوں، ان کی زندگی ایسے تصورات اور ایسے اداروں سے بالکل خالی تھی جو سیاسی اتحاد کی بنیاد بن سکتے تھے۔ ان کی جماعت مختلف قبیلوں میں تقسیم تھی اور الگ الگ قبیلوں میں تقسیم رہی۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، آریوں کی معاشرت اور ذہنیت نے ایسا رنگ اختیار کیا جس نے اتحاد کے امکانات پیدا کرنے کے بجائے دشواریوں میں اضافہ کر دیا۔ آریا جماعت ذاتوں میں تقسیم ہوئی اور ذاتیں مقام کے اعتبار سے کھری اور کھوٹی ٹھہرائی جانے لگیں۔ لطف تو یہ ہے کہ اس قانون میں بھی جو ساری آریا جماعت کے لئے بنا مقامی اختلافات کے لئے گنجائش رکھی گئی۔ ہم کو دوسرے ذریعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاتوں کی تقسیم اتنی صاف اور سلجھی ہوئی نہیں تھی جیسا کہ قانون سے ظاہر ہوتا ہے، لیکن قانون والوں اور مذہبی رہنماؤں نے فرائض مقرر کرنے اور حوصلوں کو محدود کرنے کی جو تدبیریں سوچیں انھوں نے جماعت کی سیاسی وحدت کا خیال قائم نہیں ہونے دیا۔ وحدت کا خیال پیدا اس طرح ہوتا ہے کہ جماعت کو ایک نسل سے ہونے کا احساس ہو یعنی وہ ایک زبان بولتی ہو اور اس کے پہناوے، کھانے پینے،

اور رہن سہن میں یک رنگی نہیں تو یکسانی ضرور ہو۔ اس قسم کے اتحاد کو مذہب ایک ظاہری صورت دیتا ہے اور زندگی کو ایک خاص ڈھرے پر، ایک خاص منزل مقصود کی طرف لے جاتا ہے اور اسی وجہ سے بہت سے لوگ مذہبی اتحاد کو سیاسی اور معاشرتی اتحاد کی جان سمجھتے ہیں۔ آریوں کے زمانے میں نسل کا ذات سے الگ کوئی خاص تصور نہ تھا دینی زبان سنسکرت تھی، بول چال کی زبان کچھ اور، آریا پہناوے اور رہن سہن کی وضع بھی قریب قریب ایک سی تھی، لیکن اس قسم کا میل جول نہ تھا جو سیاسی اور معاشرتی یکجہتی کے خیال کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس لئے اشتراک عمل کا دینی اور قانونی اصول اس اختلاف پر غالب نہ آسکا جو ذاتوں کی تقسیم نے پیدا کیا تھا ہر ذات اپنے فرائض کی ادائگی یعنی اپنی مخصوص اغراض حاصل کرنے کی فکر میں پڑ گئی اور یہ اغراض ایک دوسرے سے اس قدر دور تھیں کہ کہیں پر ملتی نہ تھیں۔ وہ طبقہ جس کی محنت سے سب کام چلتا تھا، جس کا پیٹ کاٹ کر سب اپنا پیٹ بھرتے تھے اس طرح ذلیل اور مجبور کر دیا گیا کہ اونچی ذاتوں کے لوگ اطمینان سے اپنے خاص کاموں میں لگے رہ سکتے تھے۔

ہندستان کی آبادی کو ذات اور فرائض کی تقسیم کی دلدل سے

گوتم بدھ نے نکالا۔ بدھ مت عقائد کا آگے ذکر آئے گا یہاں پر میں بس اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں کہ بدھ مت نے مذہبی حیثیت میں یکسانی پر اصرار کیا، مختلف ذات کے لوگوں میں میل جول بڑھایا، زبان کے اختلاف کو تسلیم تو کیا، اس لیے کہ یہ اختلاف موجود تھا مگر اسے کوئی رکاوٹ نہیں بننے دیا بلکہ بول چال کی زبان کو مذہبی زبان بنا دیا۔ اشوک کے زمانے میں بدھ مذہب کا سرکاری مذہب بننا ایک گہرے اور سچے اتحاد کا پیش خیمہ ہو سکتا تھا اور موریا سلطنت کی تنظیم اور اشوک کے تبلیغی شوق کا حال پڑھ کر اتحاد کے شیدائی کو امکانات کے عجیب عجیب منظر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن اشوک کے مرنے پر بدھ مت نے اپنی حیثیت کھو دی۔ اس میں دنیا کے کاروبار کی کوئی قدر تھی بھی نہیں اور اس طرح اجتماعی مذہب نے ملی اتحاد کا جو احساس پیدا کیا تھا وہ سیاسی دنیا میں بارآور نہ ہو سکا۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں جب کشن سامراج قائم ہوا تو بدھ مذہب دوبارہ سرکاری مذہب بنا۔ لیکن یہ رونق ڈوبتے ہوئے آفتاب کی تھی۔ ہندستان کے اندر بدھ مت کا زوال شروع ہو گیا تھا اور اگرچہ وہ بڑی تہذیبی خدمتیں انجام دیتا رہا، اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ملک کی سیاسی شیرازہ بندی کے کام آ سکے۔

کشن سلطنت نے نئی نسلوں کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھول دیا، اور اس کے بعد سے بیرونی نسلیں ہندستان کے اندر آتی اور آباد ہوتی رہیں۔ پنجاب، سندھ اور راجپوتانہ گپت سلطنت میں شامل نہ تھے اور اسی وجہ سے ہمیں یہاں کا حال معلوم نہیں۔ لیکن گپت سلطنت کی تباہی کے بعد جب گرد وغبار بیٹھ جاتا ہے تو ہم ایک نئی نسل کو ہندستانی زندگی کی تعمیر کا کام جاری رکھنے کے لئے تیار پاتے ہیں۔ اس نئی نسل کا بہت بڑا حصہ آریوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا، لیکن جن لوگوں نے اسے تہذیب کے پہلے سبق پڑھائے، وہ اپنے مذہب اور قانون کا سلسلہ جاری رکھنے کی فکر میں تھے، اور اس لئے یہ نئی نسل کشتری کہلائی اور اس کا حاکم طبقہ راجپوت۔ راجپوتوں کو بدھ مت عقائد سے عداوت تھی اور انھیں اتحاد کی ان روایتوں سے کوئی فیض نہیں پہنچا جو بدھ مت کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ لیکن راجپوت خود بہت پھیلے ہوئے تھے، وہ زندگی پر بالکل حاوی تھے اور ان کا اتحاد ہندستان کا اتحاد بن سکتا تھا۔ افسوس ہے ایسا نہیں ہوا۔

راجپوت مقام کے پابند نہیں تھے، مگر ذات اور خاندان کو بہت مانتے تھے۔ ان میں حوصلہ بہت تھا لیکن حوصلے کی رہبری اکثر شخصی اور خاندانی

عداوتیں کرتی نہیں۔ ان کی طبیعت تدبیر اور مصلحت اندیشی سے بھاگتی تھی لڑائی
ان کے لئے ایک سیاسی چال نہیں تھی، جاں بازی اور بے باکی کا مظاہرہ
ہوا کرتی تھی۔ اس وجہ سے ہندستان کا اتحاد، تب بھی جب کہ مسلمانوں کے
اس ملک پر قابض ہو جانے کا اندیشہ تھا، کبھی ان کے حوصلوں اور تدبیروں
میں نمایاں نہیں ہوا۔ ہندستان کے نام کی طرح سیاسی اتحاد کا ارادہ بھی
مسلمان اپنے ساتھ لائے، مسلمانوں کو اسلام نے ملک اور نسل کی قید سے
آزاد کر دیا تھا ان کی تاریخ کے نشیب و فراز نے ان کے دل میں سیاسی
مصلحت کی قدر پیدا کر دی تھی، ان میں خود غرضی اور کینہ پروری کی کمی نہیں
تھی، مگر وہ تدبر بھی تھا جو ان رکاوٹوں کو دور کر سکتا ہے۔ پھر وہ خاص زمانہ
جب کہ مسلمان یہاں آئے ایسا تھا کہ سیاسی تنظیم کے بغیر سلامتی ناممکن تھی۔
محمود غزنوی کے بعد غزنی کی ریاست سلجوقیوں اور غز ترکوں کے سیلاب
میں ڈوب چکی تھی، محمد غوری بھی اسی سیلاب کو روکنے کی کوشش میں لگا رہا،
اور اسی سے بچنے کے لئے ہندستان کو ایک جائے پناہ بنانے کی فکر کی۔
اس کے مرنے کے بیس برس بعد تاتار خوارزم، خراسان اور ایران پر ٹوٹ
پڑے اور ۱۲۲۲ء سے کچھ اوپر اسّی برس تک افغانستان اور ماوراالنہر کے
تاتار حاکم اس طرح سے گھات میں بیٹھے رہتے تھے کہ ہندستان والوں کے

لئے ذراسی غفلت کرنا غضب ہو جاتا تھا۔ یہی مستقل خطرہ تھا جس کی بدولت ہندستانی ترکوں کی سیاسی اہلیتیں ابھریں اور ان کی سلطنت ایک مکمل سیاسی ادارہ بنی، ریاست کی سرحدیں محفوظ کی گئیں، ماتحت حاکموں اور عام رعایا کو فرماں برداری کا سبق سمجھا بجھا کر اور مار پیٹ کر پڑھایا گیا اور حکومت نے سیاسی مصلحت کی بنا پر ہر معاملے میں دخل دینا اور ہر جگہ پہنچنا اپنا خاص مشرب بنایا۔ مسلمانوں سے پہلے کی ہندستانی ریاستوں میں چکرورتن یا مہاراج ادھی راج خود مختار راجاؤں کا بزرگ اور سردار ہوتا تھا اور ہر راجہ اپنی پرجا کا باپ اور سرپرست مانا جاتا تھا مسلمانوں کی ریاست نے شاہی فرماں روائی کو حکومت کا واحد اصول فرض کیا، خدمت اور ایثار کے حق کے سوا ماتحت حاکم اور رعایا کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا۔ پہلے ریاستیں مرنجاں مرنج تھیں اور دوستی اور دشمنی کے درمیان بے تعلقی کو بھی ایک ممکن صورت حال سمجھتی تھیں۔ مسلمانوں کی ریاست نے بے تعلقی کو خلاف مصلحت جان کر اطاعت یا عداوت میں بدل دینے کی ہر طرح سے کوشش کی۔ سب سے اہم اور بالکل نئی بات یہ ہوئی کہ ریاست کے اندر ربط اور یکسانیت پیدا کرنے کے لئے مرکزی اقتدار حتی الامکان بڑھایا گیا اور " دو بادشاہاں در اقلیمے نہ گنجند " کے پرانے

اصول کی ایسی تشریح کی گئی کہ ہندستان کے اندر ایک سے زیادہ فرماں روا کا ہونا بے عقلی، پست ہمتی اور بد نظمی کی علامت ہوگئی۔ دو مرتبہ مسلمانوں نے اپنا یہ حوصلہ کہ ہندستان ایک ریاست ہے اور ایک فرماں روا کے ماتحت ہے قریب قریب پورا بھی کرلیا۔ لیکن سیاسی اور اخلاقی حوصلے دراصل پورے اسی وقت ہوتے ہیں جب وہ عادتیں بن کر زندگی میں شامل ہوجائیں اور اس حد تک مسلمانوں کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ بادشاہوں کی نااہلیت یا کوتاہ اندیشی، افراد کی خود غرضیاں، پھر وہ غیریت جو مٹ مٹ کر بھی ابھرتی رہی اور سب سے بڑھ کر آمد و رفت کی دشواریاں ایسی مشکلیں تھیں جن پر جوش اور تدبر صرف تھوڑے عرصے کے لئے غالب آسکا۔ مگر آپ انسانی زندگی کی اونچ نیچ کو دیکھئے، اس پر غور کیجئے کہ ہندستان کے سیاسی اتحاد سے کہیں زیادہ اہم مقاصد کتنی مدت کے لئے آدمی کے دل کو اپنے قابو میں رکھ سکے ہیں تو آپ کو اطمینان ہوجائے گا کہ مسلمانوں کا یہ کارنامہ بہت بڑا مرتبہ رکھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سوائے ریل گاڑی ایجاد کرنے کے مسلمانوں نے اس ملک کو متحد کرنے اور اسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک سیاسی جماعت کا میدان عمل، ایک قوم کا دیس بنا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب دیکھنا ہے کہ نئی

تعلیم، آمدورفت کے نئے ذریعے، نئی سیاسی اور معاشرتی تنظیم، اتحاد اور اتفاق کو کونسا نیا روپ دیتی ہے۔ اگر مسلمانوں نے اپنی تاریخ اور اپنے تاریخی مقاصد سے منہ نہ پھیرا تو کچھ تعجب نہیں کہ نیا اتحاد پرانے سے زیادہ پائدار ہو۔

ہندستان کو ایک ملک، ہندستانیوں کو ایک سیاسی جماعت بنانے میں مذہب نے بڑا سہارا دیا اور اگرچہ اب روشن خیالی اور قومیت کی نظروں میں مذہب سے بڑھ کر ترقی کا کوئی دشمن نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ مذہبی تاریخ سے زیادہ ہندستانی زندگی کے کسی اور پہلو میں نشوونما اور ترقی کے واضح ثبوت نہیں ملتے۔ مگر مذہبی ارتقا کی حوصلہ افزا کہانی بیان کرنے سے پہلے میں یہ عرض کردینا چاہتا ہوں کہ مذہبی عقیدوں میں مذہبی ترقی اور نشوونما کے امکانات کا تصور نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ مذہبی رہنما دنیا کو ایک جگہ پر قائم رکھنا یا حاکم طبقے کے اختیار اور اقتدار کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ مذہبی عقیدہ کوئی خیال نہیں ہوتا جو اپنے تجربے اور دوسروں کی رائے پر غور کرکے قائم کیا جائے، مذہب جس انجام کو سوچتا ہے وہ کسی زمانے کی معاشرتی حالت کو دیکھ کر اور ترقی کے انتہائی امکانات کا اندازہ کرکے اخلاقی اور دینی حوصلوں کا محرک نہیں بنایا جاتا۔ سچا عقیدہ تو

بس ایک نور ہے کہ آیا اور دل میں سما گیا، وہ زمین آسمان کو چاک کر کے اور زمانے کی سدا بہتی اور بہاتی ہوئی بے کنار ندی کو پار کر کے آتا ہے اور جس دل میں وہ سما جائے اسے بھی وہ زمین اور زمانے کی قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ مگر اس نور میں تجلی کی یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ اسی دل کی طرف رخ کرتا ہے جو اسے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جو اسے عقیدے اور مثال کی ٹھوس شکل میں دوسرے دلوں تک پہنچا سکتا ہو اور ان میں بھی اس کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہو کہ اصل نور کو قبول کر سکیں۔ مذہبی نشو و نما سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ نور بہتر قسم کا نور ہوتا گیا، بلکہ اسے بہتر عقیدے اور بہتر مثال میں مجسم کیا گیا، اس نے زیادہ لوگوں کے دل پہ اثر ڈالا اور اخلاق اور قانون کو سدھارتا رہا۔

انسانی زندگی کا ہمیں کوئی ایسا دور نہیں ملتا ہے جب انسان کا کوئی مذہب نہ تھا، لیکن جیسے کہ نئی تعلیم کے مطابق آدمی کا جسم کہیں لاکھوں برس کے ارتقا کے بعد اس لائق ہوا کہ ان تمام صلاحیتوں کو قبول کر سکے جو اس وقت ہم انسان میں پاتے ہیں ویسے ہی اس کی سمجھ اور اس کا دل ہزاروں برس کے ارتقا کے بعد اس لائق ہوا کہ صحیح اور سچے دین کا گھر بن سکے۔ شروع میں انسان بالکل مجبور تھا، قدرت

کے بدلتے تیور اس کی زندگی کے نشیب و فراز تھے، وہ آگ، پانی، ہوا، زمین، سورج اور بادل کے سامنے سربسجدہ رہتا تھا اور آبا و اجداد کی پرستش اور اپنی اولاد کی کثرت میں اسے اپنی بقا کی ایک عملی صورت نظر آتی تھی۔ ابتدائی مذہبوں میں اس ذہنی کیفیت کے ساتھ ایسی رسمیں بھی ملتی ہیں جن کا مقصد دیوتاؤں یعنی قدرت کو تسخیر کرنا تھا اور انھیں ہم پرانے تعویذوں، منتروں اور آج کل تک جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے میں دیکھتے ہیں۔ قدرت کو تسخیر کرنے کی ان کوششوں کے پہلو بہ پہلو آدمی کی طبیعت اور حوصلے کو قابو میں رکھنے کے لئے قانون بنائے گئے اور مذہبی رہنماؤں نے مذہبی رسموں کی ادائگی کے ساتھ قانون کی پیروی کرانے کا فرض اپنے ذمے لے لیا جو بے شک بڑے فائدے کے کام بھی تھے۔ اتنا تو دنیا میں ہر جگہ ہوا اور ہندستان میں بھی قدیم آریہ مذہب اور تہذیب نے یہ سب مرحلے طے کئے، لیکن ہندستان کی قسمت سے یہاں کے مذہبی رہنماؤں نے بڑی مستعدی سے کام کیا اور بالکل ابتدائی زمانے سے مذہب اور قانون کا پورا سرمایہ محفوظ رکھا گیا۔ یہ ایک بڑی علمی خدمت تھی جس کا بعد کی نسلوں کو احسان ماننا چاہیے، لیکن دوسری طرف اس نے ہمیں الجھن میں بھی ڈال دیا کیونکہ ہم سمجھتے رہے کہ زندگی کی صورت وہی تھی اور وہی رہی جو

قانون میں فرض کی گئی ہے اور زندگی میں جو انقلاب ہو تا رہا تھا اسے ہم نے بالکل نظر انداز کیا۔ لیکن اب ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آریوں کے مذہبی تصورات شاخ در شاخ بڑھتے اور اخلاقی تجربے اور حوصلے سے متاثر ہوتے گئے، ان کے دیوتاؤں کی تعداد بڑھی اور مراتب بدلے تو دوسری طرف وحدت الوجود کا عقیدہ بھی نمایاں ہوتا گیا۔ انھوں نے زندگی کو احاطے میں بند کرنے کے لیے قانون بنائے تو زندگی بھی ایسی پھیلی اور پھلی پھولی کہ ہر طرف احاطے کی دیوار کو گراتے گراتے چھوڑا۔ آخر کو ایک ایسا انقلاب بھی ہو گیا جس نے دیواروں کو گرا ہی دیا۔

اس انقلاب کے کئی اسباب تھے اور اسے ہر شخص اپنی بساط کے مطابق سمجھ سکتا ہے اور سمجھا سکتا ہے۔ اس میں معاشرتی کشمکش کا پہلو بھی تھا، اس لئے کہ ایسے لوگوں کی دولت اور اثر بہت بڑھ گیا تھا جنھیں برہمنوں نے علم اور کشتریوں نے دنیاوی حیثیت سے محروم کر رکھا تھا اس میں اس مذہبیت سے بیزاری بھی تھی جس نے فلاح اور نجات کو اخلاقی حوصلے اور معیار سے جدا کر کے رسموں، قربانیوں اور برہمنوں کی خاطر مدارات پر موقوف کر دیا تھا، لیکن اس میں وہ نور بھی تھا جو ایک دل میں سما جائے تو ساری دنیا میں نئی جان ڈال سکتا ہے۔ اس انقلاب کے بانی گوتم بدھ

کی شخصیت اور تعلیم میں کئی ایسی صفات تھیں جو بعد کو اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب کے ساتھ پھیلیں اور انسانی تہذیب کا سرمایہ ہی نہیں بلکہ اس کا مایۂ ناز بن گئیں۔ گوتم بدھ نے انسان کے اخلاقی حوصلے کو جگایا، اسے اپنے پیروں پر چلنا سکھایا اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے سچے عقیدے اور صحیح عمل کی ضرورت سمجھائی۔ انھوں نے مساوات کی تعلیم دی اور دنیا ہی میں نہیں بلکہ دین میں بھی برہمن اور چنڈال، امیر اور غریب، مرد اور عورت کو یکساں مرتبہ دے کر بڑا اسی کو مانا جسے تہذیبِ نفس اور خدمت بڑا بنائے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اعتدال کی بھی قدر پہچانی اور اس ریاضت کا بھانڈا پھوڑ دیا جو اس وقت ایک وبا بن کر پھیل گئی تھی۔ گوتم بدھ نے دنیا میں سب سے پہلے دین کی تبلیغ کا چرچا کیا یعنی دین کو مقامِ نسل اور روایات کی کال کوٹھری سے نکالا اور اپنی تعلیم کو مذہبی رہنماؤں اور ان کے علم اور تقدس سے محفوظ رکھنے کے لیے بول چال کی زبان کو مذہبی زبان بنا دیا۔

لیکن اگر گوتم بدھ کی تعلیم میں اتنی طاقت تھی کہ ہندستانی زندگی کی کایا پلٹ دے تو اس میں ایسی خصوصیات بھی تھیں جو سراسر ماحول اور روایات کی پیدا کی ہوئی تھیں اور جنھوں نے اصل تعلیم کو جتنا کہ ممکن تھا

اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ گوتم بدھ اپنشدوں کے پڑھنے سے اس دھوکے میں پڑ گئے کہ حقیقت کا علم ہونا کافی ہے، اور انھوں نے قانون بنا کر علم اور اخلاقی حوصلے کو سہارا نہیں دیا۔ وہ شاید فلسفیوں کی موشگافیوں سے گھبرا گئے تھے یا وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ مافوق الطبیعی مسائل میں الجھ کر اچھے اخلاق اور صحیح عمل کی اہمیت سے غافل ہو جائیں، اس لئے انھوں نے اپنی تعلیم کو سادے اور سلجھے ہوئے عقیدوں کی شکل بھی نہیں دی اور ان کی وفات کے بعد ہی ان کے پیرو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ہمیں پرماتمن اور آتمن یعنی خدا اور روح کو ماننا چاہیئے یا نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ گوتم بدھ کی تعلیم میں سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس میں دنیاوی زندگی کو کوئی حیثیت، کوئی شکل صورت نہیں دی گئی گوتم بدھ نے ریاضت کو بتایا تھا کہ بے سود ہے، مگر وہ خود اور ان کے چیلے بھیک مانگ کر گذر کرتے تھے اور اس طرح اگرچہ بدھ متیوں میں ریاضت کا کبھی رواج نہ ہوا، ان کی جماعت بہت جلد دنیا داروں اور دین داروں میں تقسیم ہو گئی اور دین دار جوگیوں کا بھیس بنا کر دنیا کے کاروبار سے دور خانقاہوں اور کھوہوں میں رہنے لگے۔ انھیں سب باتوں کا آخر میں یہ نتیجہ ہوا کہ ہندستان کے اندر بدھ مت آہستہ آہستہ ہندو دھرم میں جذب ہو گیا اور گوتم بدھ کے نام لیوا تبت

اور چین اور مشرقی ایشیا ہی میں رہ گئے۔

لیکن اس پر بھی دیکھئے کہ بدھ مذہب کیا کیا کر گیا۔ اس کے مبلغوں نے ہندستان بھر کو چھان ڈالا اور ہندستان کے باہر بھی تمام آس پاس کے ملکوں میں پہنچے۔ انھوں نے سنگھ کو، جو کہ غالباً ملت کے تصور کی سب سے پہلی شکل تھی مقام، ذات، نسل، ملک سب پر حاوی کر دیا اور نوع انسانی کو یگانگت پیدا کرنے کا ایک نیا ڈھنگ سکھایا۔ انھوں نے ایک طرف بول چال کی زبان کو مذہبی زبان بنایا تو دوسری طرف سنسکرت کو برہمنوں سے چھین لیا اور اسے ایک ادبی زبان کی حیثیت سے ساری جنتا کو دے دیا۔ انھوں نے دینی اور اخلاقی تعلیم کو دل نشیں کہانیوں میں حل کر کے دنیا بھر میں بانٹا اور جاتکوں کے قصے، جنھوں نے بڑھ کر پنچ تنتر کا نام پایا اور جن کا ترجمہ پہلوی میں "کلیلہ دمنہ" کے عنوان سے شائع ہوا دنیا میں اس طرح پھیلے کہ حواس اور خواص انسانی کی طرح ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ پھر بدھ متیوں نے شاید دنیا میں سب سے پہلے بڑے پیمانے پر یونیورسٹیاں قائم کیں اور تعلیم کا چرچا کیا۔ ان کے عالم اور فلسفی مشہور رہتے اور ایک طرف ان عالموں اور دوسری طرف حکمت کے اس خزانے نے جو "کلیلہ دمنہ" کے قصوں میں بھرا ہوا تھا ہندستان کو دنیا میں سرخ رو

اور ممتاز کیا۔ علم طب کی بنیاد بھی بدھ متیوں نے رکھی۔ پہلے طبیب کا شمار اچھوتوں میں ہوتا تھا، بدھ متیوں نے صحت اور اخلاق کے تعلق کو دیکھ کر اور جھاڑ پھونک کی لغویت کو سمجھ کر طبیب کو اخلاق کا معلم اور عنبا کا قابلِ قدر خادم بنایا۔ یہ کہنے کو تو ایک بہت معمولی بات ہے، لیکن اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ بدھ متی تعلیم نے آدمی کے ذہن کو کیسا آزاد کیا تھا اور اوہام پرستی کا جادو توڑ کر انسان کو اپنی بھلائی کی تدبیریں کرنا کس طرح سکھایا تھا۔

آٹھویں اور نویں صدی میں بدھ مت ہندستان سے غائب ہو گیا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ بدھ متی عقائد عام ہندستانی مذہب سے اس قدر ہم آہنگ ہو گئے تھے کہ اس میں مل جائیں۔ میں اس عام ہندستانی مذہب کو ہندو دھرم کہنا غلط سمجھتا ہوں اس لئے کہ ہندو کا لفظ ابھی تک رائج نہیں ہوا تھا اور عقیدوں اور قاعدے قانون کا وہ مجموعہ جسے ہم اس وقت ہندو دھرم کہتے ہیں اپنی موجودہ شکل میں نویں اور دسویں صدی میں نمودار ہوا۔ اس دھرم نے بدھ مت سے تبلیغ کا شوق اور مذہبی اتحاد اور ملت کا تصور حاصل کیا اور بدھ متی رواج سے متاثر ہو کر گوشت کھانا اور قربانیاں کرنا بند کر دیا۔ بدھ مت کے اثرات میں سے ایک جاترا کا

رواج بھی تھا جس نے مختلف مقامات کو خاص تقدس دے کر ان کے تیرتھ کو ثواب کا کام ٹھہرایا اور جیسے بدھ متی دور دور سے ان مقامات کی زیارت کرنے کو آتے تھے جن کا گوتم بدھ کی زندگی میں خصوصیت کے ساتھ ذکر آتا تھا، ویسے ہی اس نئے دھرم کے ماننے والے جاتری ثواب کی خاطر ہندستان بھر کا چکر لگانے لگے۔ اس کی بدولت اتحاد اور یک جہتی کا جو خیال پیدا ہوا اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ قدیم مذہب نے ہندو دھرم کا یہ نیا روپ اس وجہ سے لیا کہ ساتویں صدی سے جنوبی ہندستان میں اسلام کی تبلیغ شروع ہو گئی تھی اور قدیم مذہب کے دور اندیش پیرو یہ سمجھ گئے کہ اگر انھوں نے آپس کے اختلاف کو دور کر کے اور اپنے عقیدوں اور رسموں کو ایک جنتا کا دھرم بنا کر اس کی مورچہ بندی نہ کر لی تو وہ اس نئے مذہب کے سامنے ٹھہر نہ سکے گا۔ ان کے اس احساس کو یا اس کی بدولت جو اصلاحیں اور تبدیلیاں ہوئیں ان کو تعصب یا ضد کا نتیجہ سمجھنا بڑی غلطی اور بے انصافی ہو گی۔ دراصل یہ زندہ ہونے اور زندہ رہنے کی اس قدرتی خواہش کی علامتیں ہیں جو ہر جان دار میں پائی جاتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو نہ ترقی ہو گی اور نہ زندگی۔ گوتم بدھ کا مذہب اپنے ساتھ ایک انقلاب لایا تھا، وہ آسانی سے پھیل گیا۔ اسلام بھی ایک انقلاب کا سامان اور ایک نئی زندگی کا



مژدہ اپنے ساتھ لایا، مگر اس کی قدم قدم پر مخالفت ہوئی۔ اس مخالفت کا سبب عقیدوں کا اختلاف نہیں تھا بلکہ ہندو دھرم کی بڑھی ہوئی طاقت اور یہی طاقت ظاہر کرتی ہے کہ اس زمانے کے مقابلے میں جب کہ گوتم بدھ نے اپنا سنگھ قائم کیا ہندستان کی مذہبیت نشو و نما اور ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔

گوتم بدھ کی تعلیم میں اسلام کی جو جھلک نظر آتی ہے اس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ہندو دھرم نے مساوات کے اصول کو قبول نہیں کیا اور اپنی سماج میں عقیدے اور رواج کے اختلاف کو جتنا کہ کامل اتحاد کے لئے ضروری تھا مٹا نہیں سکا۔ لیکن بدھ متیوں سے اس نے جو کچھ سیکھ لیا تھا اس کی بدولت وہ اسلام کی ٹکر لے سکتا تھا اور اسی صلاحیت کو آپ دوسرے اور میرے خیال میں صحیح پہلو سے دیکھئے تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہندستانیوں کے دینی احساسات اس قدر نشو و نما پا چکے تھے کہ اسلامی عقائد کی قدر پہچان سکیں اور مذہبی ارتقا کا جو سلسلہ پہلے سے چلا آرہا تھا وہ جاری رہ سکے۔ اسلام کو تبلیغ کی خاطر جہاں کہیں بھی بہت زیادہ جھکنا پڑا جیسے کہ ہندستان کے کئی پس ماندہ قبیلوں میں، وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنی اصل سے بہت دور ہو گیا اور اگر سارے ہندستان کی حالت ویسی ہی ہوتی جیسی کہ سندھ اور پنجاب کے ان قبیلوں کی جو خدا کے ساتھ دریا کو بھی

خاص موقعوں پر پوچھتے ہیں تو ہمیں آج کل یہاں بہت کم مسلمان ملتے اور اسلام کی بدولت ہندو دھرم میں جو اصلاحی کوششیں ہوئیں ان کا بھی امکان نہ ہوتا۔

اس وقت اگر ہم اس کا فیصلہ کرنا چاہیں کہ مذہبی نقطۂ نظر سے ہندستان کے مسلمانوں نے ترقی کی یا تنزل تو ہمیں سب سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ ہمارا معیار کیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے ایک معیار موجود ہے جو ہمیشہ کے لئے کافی ہے، یعنی قرآن شریف اور سیرت رسول۔ لیکن یہ معیار دینی ہے تاریخی نہیں، اس سے ہم یہ بے شک معلوم کر سکتے ہیں کہ کون سا عقیدہ، کون سا حوصلہ صحیح ہے اور کون سا غلط، لیکن یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ ان تھوڑے سے عرب تاجروں میں جو مغربی ہندستان کے ساحل اور جنوبی ہند میں آکر آباد ہوئے یا ان ترکوں میں جو شمالی مغربی دروں سے ہندستان میں گھس آئے اور یہاں ایک سیاسی نظام کی تعمیر میں مشغول ہو گئے مذہبی نقطۂ نظر سے کون سی خصوصیات تھیں اور ہم ان کا بعد کے ہندستانی مسلمانوں سے مقابلہ کریں تو ہمیں ذہن اور تخیل میں زیادہ لوچ اور وسعت، اسلام کو مجموعی طور پر قبول کرنے اور اپنی زندگی کو ایک مثال بنانے کی صلاحیت کم ملے گی یا زیادہ۔ یہی طے کرنے کے

بعد ہم بتا سکتے ہیں کہ ہندستانی مسلمانوں کی کارگذاری کیا قدر و قیمت رکھتی ہے۔
ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی برابر بڑھتی رہی ہے اور اسے قدرت ہی نے نہیں بڑھایا بلکہ تبلیغ نے بھی۔ ہندستانی مسلمانوں نے مساوات اور ملت کے احساس کو برابر قائم رکھا اور ملک کی وسعت، تعلیم اور تنظیم کی کمی کو دیکھئے تو ہم پیر پرستی اور گنڈے تعویذ کے رواج کے ہوتے ہوئے بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے عقیدوں کو نہیں چھوڑا۔ حکومت کے زمانے میں بھی ہماری عام رائے مذہبی اصولوں کو اس قدر عزیز رکھتی تھی کہ ریاست ان کا لحاظ کرنے پر مجبور ہوئی اور دربار کی بے عنوانیاں اور بد اخلاقیاں شخصی رہیں، فتوے اور خوشامد انھیں کبھی جواز کی سند نہ دے سکی۔ اس کے آگے دیکھئے تو ہم نے علوم دینی کی خاصی خدمت کی ہے اور اگر ہم قانون کو ملک کے عام رواج سے محفوظ نہیں رکھ سکے تو ہم میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے رہے جنھوں نے رواج کو توڑا اور قانون کی برتری جتا دی۔ ان سب باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ خالص دینی نقطۂ نظر سے ہم نے تنزل نہیں کیا۔ حکومت ہمارے ہاتھ سے بے شک نکل گئی اور ہم میں سپاہیوں کی وہ صفات نہیں رہیں جن کے زور سے ہندستان میں ہماری حکومت قائم ہوئی۔ لیکن آپ ان لوگوں کی پوری

زندگی کو دیکھئے جنھوں نے جنگ اور سیاست کے میدان میں نام پیدا کیا تو آپ اسے تمام ایسی صفات سے محروم پائیں گے جو استحکام اور پائداری کے لئے ناگزیر ہیں۔ انھیں خامیوں کی وجہ سے ہماری سیاست اور ہمارے مذہب میں سچا میل نہ ہو سکا۔ لیکن ہندستان میں اسلام کا دارومدار سپاہی کی تلوار اور مدبر کی مصلحت اندیشیوں پر نہیں تھا بلکہ عوام کے جذبۂ دینی پر اور اسی نے اپنے گمنام صوفی منش رہبروں کی مدد سے مذہبیت کو پختہ اور پائدار کر لیا اور اس میں ایسے خیالات اور تصورات شامل کر لئے جن میں تلوار کی سی تیز دھار نہیں تھی تو دل میں چبھنے کی ایسی صلاحیت تھی جو تلوار سے کہیں بہتر کام کرتی ہے۔ اسلام کو مطلب اسی جمہور سے ہے۔ یہ جمہور پہلے نہیں تھی اور اب بہت بڑھ گئی ہے اور اس نے سچے اسلامی اخلاق کی ہزارہا ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن کا جواب اونچے طبقے میں نہیں ملتا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ مذہبی نشوونما سے میرا مطلب عقیدوں کی ترمیم نہیں ہے بلکہ انھیں صحیح معنوں میں قبول کرنے اور مثال کے ذریعے سے معاشرت اور عادت میں داخل کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو ہندستانی مسلمانوں نے برابر ترقی کی ہے۔ مسلمان صوفیوں

نے تزکیہ نفس کے سلسلے میں یوگ کے سارے علم اور عمل کو اپنا لیا اور اگرچہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ہندستانیوں میں کون سب سے پہلے خدا پر عاشق ہوا اور کون سب سے زیادہ، اس میں کوئی شک نہیں کہ بھگتی مارگ یعنی عشق حقیقی کا رستہ صاف کرنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت تھی اور اس پہلی مشترک دینی تحریک میں جس نے ہندستانی ذہنیت پر بہت گہرا اثر ڈالا وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ بدھ متیوں کی طرح مسلمانوں نے بھی بول چال کی زبان کو تبلیغ کی زبان بنایا اور چونکہ وہ ایک نئی تہذیب اور تربیت یافتہ ادبی مذاق اپنے ساتھ لائے تھے، وہ اس زبان کو بہت زیادہ ترقی دے سکے اور اس کی حیثیت بڑھاتے بڑھاتے انھوں نے اس کو ادبی اور قومی زبان بنا دیا۔ امیر خسرو نے سب سے پہلے اس زبان میں لکھنے کی مشق کی اور انھیں کے کلام میں ہم سب سے پہلے یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مذاق کے ساتھ جذبۂ دینی بھی ماحول اور فضا سے ہم آہنگی پیدا کرنے لگا۔ یہ سب علامتیں ہیں ماحول سے اس مطابقت کی جس کے بغیر اخلاق اور تہذیب میں بناوٹ آجاتی ہے اور ان کی جڑیں زمین کو اس طرح پکڑ نہیں پاتیں کہ وہ بڑھیں اور پھل پھول سکیں۔

اسی مطابقت کی کوشش نے اسلام کے اثر کو بھی بڑھایا۔ رامانند،

کبیرؔ، گرونانک، چیتنیا اور تکارام کی عظمت اور اصلاحی کوششوں سے بہتر اس کا کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ یہ اثر گہرا اور سچا تھا اور ان لوگوں کے خیالات اور طرزِ عمل کو دیکھئے، جنھوں نے تلسی داس کی طرح ہندو دھرم کو مستحکم اور مضبوط کیا تو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اثر بہت وسیع تھا اور خالص فیض بھی پہنچا سکتا تھا۔ مسلمان ہندستان کے اندر آبادی میں گھل مل کر رہے اور ان کی ترقی کا اندازہ ہمیں خود انھیں کے کارناموں ہی سے نہ کرنا چاہئے، بلکہ ان کے ساتھ رہنے والوں کی ذہنی اور اخلاقی نشو و نما کو بھی ان کی کارگذاری کا ایک حصہ اور ان کی ترقی کا آئینہ سمجھنا چاہئے۔

مغل سلطنت کے زوال پر ہمارا معاشی نظام درہم برہم ہو گیا، پھر انگریزی حکومت نے رہی سہی صنعتوں کو مٹا دیا اور ہماری زندگی کے پودے کو قدرتی استعداد کی زرخیز زمین سے اکھاڑ کر ملازمت کے اوسر میں لگا دیا۔ اسی کے ساتھ انگریزی تعلیم نے ہماری تہذیبی دولت کی قدر بہت کم کر کے دکھائی، نوکریوں کا لالچ دلا کر ہندو مسلمانوں کے درمیان ایسی عداوت پیدا کی کہ وہ تاریخ میں سے بھی اپنا اپنا حصہ الگ کرنے لگے۔ اس چھینا جھپٹی میں سب سے زیادہ نقصان انھیں چیزوں کو ہوا جو سب سے زیادہ نازک اور قیمتی تھیں اور ہم اشتراکِ عمل اور تہذیبی دولت آفرینی کے ان نمونوں اور

مثالوں کو غلط یا برا سمجھنے لگے جو ہماری تاریخ کا جوہر ہے۔ انگریزوں کی مخالفت میں قومیت کے جذبے کو بہت فروغ ہوا، لیکن یہ جذبہ ابھی تک انگریزی تعلیم سے بہت متاثر ہے، اس کی تنگی ہماری تاریخ کی وسعت پر الجھتی رہتی ہے اور اس کا ٹمٹماتا چراغ گذشتہ جد و جہد پر روشنی ڈالنے کے بجائے ہماری اپنی آنکھوں کو اندھا کر رہا ہے۔ لیکن حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنا مورخ کا کام نہیں۔ میں نے اگر موجودہ زندگی کا سلسلہ اس زمانے سے ملا دیا ہے جب ہندستانی تہذیب کی کرنوں نے پہلے پہل تاریکی اور سناٹے کا مقابلہ کیا اور آپ کو یقین دلا دیا ہے کہ وقت کے ساتھ تہذیب کا اجالا اور زندگی کا پیمانہ، تخیل کی بلند پروازی اور حوصلے کی بلند آہنگی بڑھتی رہی تو میرا فرض ادا ہو گیا۔